"O" level
Samina notes.

①

قراۃ العین حیدر

قراۃ العین حیدر انوکھے اور نرالے انداز کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف فن کی پختگی عروج پر ہے۔ بلکہ مشرقی تہذیب کا وقار اور مغرب کے تمدن کا نکھار ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اُردو افسانے کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔

قراۃ العین حیدر کے کردار زیادہ تر شہری زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں قراۃ العین حیدر کا قلم نو دولتی طبقے کو پیش کرتے ہوئے شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ عورتوں کی نفسیاتی کیفیت اور طبقاتی تضاد کے حوالے سے قراۃ العین حیدر کی تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ مصنفہ کو جو گھریلو طور پر ادبی ماحول ملا اس کے اثرات ان کی شخصیت میں نمایاں ہوئے۔ ہمارے نصاب میں شامل افسانہ نظارہ درمیاں ہے طبقاتی کشمکش اور جذباتی کیفیت کی خوبصورت مثال ہے۔

قراۃ العین حیدر اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر اپنا الگ مقام رکھتی ہیں ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی کشمکش سے وہ کہانی کو اس قدر دلچسپ بناتی ہیں کہ پڑھنے والا کہانی میں کھو جاتا ہے۔

نظارہ درمیاں ہے

قراۃ العین حیدر انوکھے اور نرالے انداز کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے۔ ان کے افسانوں مین نہ صرف فن کی پختگی عروج پر ہے بلکہ مشرقی تہذیب کا وقار اور مغرب کے تمدن کا نکھار ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اردو افسانے کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔

زیر نظر افسانہ "نظارہ درمیاں ہے" ایک پارسی لڑکی پیرو جا دستور اور ایک مسلم لڑکے خورشید عالم کی محبت کی داستان ہے۔

خورشید عالم پیرو جا دستور کی نرگسی آنکھوں کا شیدائی ہے۔ ان نرگسی آنکھوں میں خورشید عالم کی محبت کے دیئے جلتے ہیں۔ (جن کی روشنی میں خورشید عالم کو کائنات کی ہر چیز شفاف اور حسین نظر آتی ہے) لیکن ان دیئوں کی لو سے بھی زیادہ چمکدار روشنی الماس بیگم کی دولت کی ہے جو خورشید عالم کے والدین کی عقل کو خیرہ کر دیتی ہے اور وہ مذہب کی آڑ لے کر خورشید عالم کو پارسی لڑکی کی بجائے مسلم لڑکی سے شادی پر مجبور کرتے ہیں۔ خورشید عالم پیرو جا دستور کو حاصل کرنے کی ایک بے جان سی کوشش کے بعد الماس بیگم کی دولت کی چمک سے مرعوب ہو کر بالآخر اسی سے بیاہ رچا لیتا ہے۔

شادی کے بعد ڈاکٹر صدیقی انکشاف کرتے ہیں کہ ایک پارسی لڑکی مس پیروجا دستور موت سے پہلے اپنی آنکھیں عطیہ میں دے گئی ہے اور یہی آنکھیں اب خورشید اور الماس کی نوکرانی تارابائی کو لگادی گئی ہیں۔ خورشید عالم اب دیوانگی کے عالم میں تارابائی کی آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن وہ نرگسی آنکھیں خوبصورت ہونے کے باوجود اسے خالی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اب ان میں خورشید عالم کی محبت کے دیئے نہیں جلتے۔ بلکہ اب ان کی جگہ تارابائی کی حیرت براجمان ہے۔

☆ خورشید عالم محبت کی پونجی گنوا کر بے بس ہے۔

☆ الماس بیگم شکست کے بوجھ سے نڈھال ہے کیونکہ اس کی سطحی محبت خورشید عالم کا دل نہیں جیت سکی۔

☆ پیروجا کی نرگسی آنکھوں میں نظر آنے والی روشنی اور خورشید عالم کے دل کی آنکھ کے درمیان تارابائی کی حیرت براجمان ہے۔

بقول شاعر:

تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے
کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

اور پیروجا کی آنکھیں موت کے بعد بھی اس کی آنکھیں الماس بیگم کا پیچھا کرتی ہیں۔ اور پچھتاوا بن کر الماس کی زندگی کو اجیرن بناتی ہیں۔

ایہ افسانہ ہمارے معاشرتی رویوں اور دولت کی ہوس پر گہرا طنز اور ایک تلخ حقیقت کا واضح اعتراف ہے کہ معاشرے کے اہل ثروت دولت کے بل بوتے پر اپنی من چاہی ہر چیز خریدتے ہیں یہاں تک کہ انسانوں کی قیمت بھی لگا دیتے ہیں۔ دوسری طرف بکنے (فروخت ہونے والی) والے افراد بھی کچھ کم خودغرض نہیں۔ خورشید عالم ایک شریف النفس شوہر ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں بیوی کی رضا میں راضی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک اچھا ''وائلن نواز'' ہے لیکن بیوی کو اس ساز سے نفرت ہے۔ اس لیے وہ اس شوق ہی کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔

''خورشید عالم بیوی کے احسانمند ہیں کیونکہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسانمندی ایسی شے ہے کہ جس میں ایک سنگیت کار اپنے سنگیت کی قربانی دے سکتا ہے'' خورشید عالم کی تمام تر قربانی ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے ہے۔ کیونکہ بقول مصنفہ ''اقتصادی تحفظ مرد کی بہت بڑی [illegible]

الماس بیگم کا رویہ معاشرے کے خود غرضانہ طرز عمل کا عکاس ہے۔ الماس بیگم پیروجا اور خورشید عالم کو ایک دوسرے سے دور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی (کوئی کسر نہیں چھوڑتی) تاہم اس کی سطحی محبت بالآخر ناکام رہتی ہے۔ الماس بیگم کی خود

غرضی اور مفاد پرستی کا یہ عالم ہے کہ منافقت سے کام لے کر پیرا جا سے دوستی کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ چونکہ بے حد ذہین اور چالاک ہے اس لیے خوب منصوبہ بنا کر بڑی صفائی سے پیرو جا کو اپنے راستے سے ہٹا دیا پیرو جا سے جھوٹ بولتی ہے کہ اس کی خورشید عالم سے منگنی ہو چکی ہے جبکہ خورشید کو خط لکھ کر کہ پیرو جا ایک امریکی کے ساتھ ہوٹل میں رہتی ہے خورشید عالم کے دل میں غلط فہمی پیدا کر دیتی ہے۔ اور اسقدر بے رحم ہے کہ صرف اسی پر بس نہیں کرتی بلکہ ہسپتال سے خورشید عالم کے لیے آنے والی کال کے جواب بھی بڑی ڈھٹائی اور بے رحمی سے جھوٹ بولتی ہے کہ خورشید عالم وہاں نہیں رہتا۔ اس طرح بظاہر وہ خورشید عالم حاصل کرنے اور شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ قراۃ العین حیدر نے اس افسانے کے ذریعے محبت کو انسانیت کا انمول سرمایہ قرار دے کر جذبوں کی سچائی زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس طرح ایک خوبصورت تخیل کو حقیقت کے رنگ میں ڈھال کر یہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ انسان کو کوڑیوں کے مول خریدا جا سکتا ہے لیکن انسان کے دل میں بسنے والی محبت انمول ہے۔

پیرو جا کی نرگسی آنکھیں اور خورشید عالم کی محبت کا انمول سرمایہ ہیں۔ وہ ان آنکھوں کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے انہیں (اپنی آنکھوں کو) اپنی موت کے بعد کووں اور گدھوں کی خوراک نہیں بننے دینا چاہتی اس لیے ایک ''آئی بینک'' کو عطیہ میں دے جاتی ہے۔ جبکہ قدرت کا عمل ان آنکھوں کو تارا بائی کی صورت میں پھر سے خورشید عالم کے سامنے لے آتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ آنکھیں خورشید عالم کے دل کو سیراب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی تشنگی پر حیرت کا اظہار کرنے کے لیے ہیں۔ اور اس کو اس کی بے وفائی کا احساس دلانے کے لیے ہیں۔

سعادت حسن منٹو (ٹوبہ ٹیک سنگھ)

اُردو افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو کا نام مسلّم ہے۔ منٹو کے ہاں زندگی کی عکاسی مختلف انداز میں نظر آتی ہے۔ وہ معاشرے کے نظر انداز کیے ہوئے طبقات کی نمائندگی کرتے ہوئے اُن کے مسائل کو اچھوتے انداز میں افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

منٹو زندگی کے تلخ حقائق پیش کرتے ہوئے گھبراتے نہیں۔ وہ ایک بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہیں جس زمانے میں منٹو بے باک انداز میں حساس موضوعات پر اظہارِ خیال کیا اُن دنوں ایسا سوچنا بھی ممکن نہ تھا۔

وہ افسانہ ڈھالنے اور کہانی کو آگے بڑھانے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ منٹو خارجی پہلوؤں کی نسبت انسان کی باطنی کیفیات کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ اور انسانی جذبات واحساسات کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ سعادت حسن منٹو کا شاہکار افسانہ ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ منٹو کی طرزِ نگارش دیکھ کر قلم کی اس طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ منٹو جس طرح مردانہ وار زندگی کے تلخ حقائق کا پردہ چاک کرتا ہے وہ صرف منٹو ہی کا حصہ ہے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ ان کے افسانوں کے مجموعے "پھندنے" سے مستعار ہے 1955ء میں شائع ہوا اس افسانے میں تقسیمِ ملک کے وقت لوگوں کی ذہنی کشمکش اور ان مشکل حالات وواقعات کو موضوع بنایا گیا ہے جن سے دونوں مملکتوں کے لوگ دوچار ہوئے ٹوبہ ٹیک سنگھ بظاہر ایک پاگل کی داستانِ حیات ہے جس کے ذریعے اس امر کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ افراد کی زندگیوں پر گرد و پیش میں رونما ہونے والے سماجی اور سیاسی واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے اس کے علاوہ دھرتی سے متعلق لوگوں کے جذبات اور نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

vel Nadas.
inew

ٹوبہ ٹیک سنگھ (تنقیدی جائزہ)

ٹوبہ ٹیک سنگھ سعادت حسن منٹو کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ منٹو کا طرزِ تحریر دیکھ کر قلم کی اس طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ منٹو جس طرح بے باکی سے زندگی کے تلخ حقائق کا پردہ چاک کرتا ہے وہ صرف منٹو ہی کا خاصہ ہے۔

1947ء میں قیامِ پاکستان عالمی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت کے فرقہ وارانہ فسادات نے آزادی کے سورج کو گہنا دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے پاکستان اور ہندوستان کے بیشتر قلم کاروں نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ سعادت حسن منٹو نے بھی تقسیم کے اسی موضوع پر افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک منفرد انداز میں قلم اُٹھایا ہے۔

یہ عام ڈگر سے ہٹ کر لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں منٹو نے برصغیر کی تقسیم کے اثرات، اس تقسیم سے پیدا ہوئے مسائل اور لوگوں کی جذباتی کیفیات اور احساسات کا نقشہ کھینچا ہے یہ محض ایک پاگل سکھ کی کہانی نہیں۔ بلکہ یہ سکھ ایک علامت کی صورت میں اپنے زمانے کی تاریخ سے کچھ سوال کرتا ہے۔ منٹو کے مطابق سیاسی، سماجی اور معاشرتی ڈھانچوں میں توڑ پھوڑ اسی تقسیم کے باعث ہوئی اور انسان جذباتی انتشار کا شکار ہوا۔

اس سلسلے میں مصنف نے لاہور کے پاگل خانے میں بند مختلف مذہب کے پاگلوں کی گفتگو کے ذریعے ہوشمندوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر منٹو کے قلم نے خوب وہ جوہر دکھائے ہیں کہ بے اختیار اُنھیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

افسانے کے تمام کردار پاگل ہیں ان میں ہندو سکھ مسلمان عیسائی سب شامل ہیں تمام کردار پاگلوں جیسی حرکات کرتے ہیں ان کی حرکات و سکنات اور گفتگو میں گہرے معنی چھپے ہوئے ہیں۔ دراصل منٹو نے پاگل خانے کو برصغیر کا استعارہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں لوگوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ عقل و دانش پر مبنی نہیں تھا۔ کوئی پاگل پاکستان زندہ باد تو کوئی ہندوستان زندہ باد کہتا۔

عوام کی صورتِ حال بھی اس وقت کچھ ایسی ہی تھی۔ افسانے میں ایک پاگل درخت پر چڑھ کر تقریر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو ہندوستان رہوں گا نہ پاکستان میں اسی درخت پر رہوں گا۔ اس اشارے کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم کے وقت فسادات کے خوف سے لوگ عدمِ تحفظ کا شکار ہو گئے تھے۔ ان پاگلوں میں ایک پاگل مسلم لیگ کا رکن رہ چکا ہے۔ وہ خود کو محمد علی جناح کہتا ہے اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ خود کو ماسٹر تارا سنگھ کہتا ہے اور دونوں میں ''ٹھن'' جاتی ہے۔ اس اشارے سے مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ لوگوں کی آپس کی دشمنی دونوں اطراف کے لیڈروں ہی کی وجہ سے تھی۔ افسانے میں ایک وکیل پاگل بھی ہے جس کی محبوبہ ہندوستان میں رہ گئی ہے۔ منٹو کی اس

[illegible]

مثال کے مطابق یہ تقسیم صرف دو ملکوں کی سرحدوں کی تقسیم نہ تھی بلکہ دلوں محبتوں اور جذبوں کی تقسیم تھی۔ اکثر پاگل ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کہ نہ جانے کب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ منٹو کے خیال میں سرحد کے دونوں طرف محبت کے ایسے ہی جذبات تھے۔

ہوش وحواس سے عاری بشن سنگھ کے کردار کے ذریعے مصنف نے اپنے موقف کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ منٹو کے نزدیک ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ سیاسی لیڈر اپنے مفاد کے تحت عمل میں لائے تھے۔ منٹو کو اذیت اس بات کی تھی کہ اس مفاد پرستی میں ان لیڈروں نے ان دونوں ممالک کے شہریوں کو قربانی کا بکرا بنایا۔ منٹو کی رائے میں ہندوستان کی تقسیم ایک عام شہری کے لیے ناقابلِ فہم بات تھی۔ عام لوگوں کے لیے نظریات کی نہیں صرف اپنی دھرتی ماں (زمین) اور گھر کی اہمیت تھی۔ مذہب کے نام پر تفریق اور تقسیم سیاستدانوں کا کام تھا عام لوگوں میں تو دوستی اور اتفاق بھی تھا۔ جیسا کہ ہوش وحواس کے زمانے میں بشن سنگھ اور فضل دین کے تعلقات سے پتہ چلتا ہے۔ مزید یہ کہ اس تقسیم کی وجہ سے لوگ عجب شش وپنج (کشمکش) میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف اُن کی زمینیں، جائیدادیں اور گھر بار تھے تو دوسری طرف ہندوستان اور پاکستان کی مذہب کے نام پر تقسیم تھی۔ ان کو یہ بات سمجھ نہ آتی تھی کہ دونوں میں سے کس کو دیں۔

''ایک پاگل تو ہندوستان، پاکستان، پاکستان ہندوستان کے چکر میں ایسا پڑا کہ اور پاگل ہو گیا'' اس پر بشن سنگھ کا دیوانگی کے عالم میں (جبکہ وہ اپنے بیوی بچوں تک کو بھول چکا ہے) بار بار اپنے وطن ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بارے میں پوچھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ بشن سنگھ چھوڑ کر ایک اجنبی ملک میں نیا ٹوبہ ٹیک سنگھ آباد کرنے کو تیار نہیں وہ جان دے دیتا ہے لیکن اپنا ٹوبہ ٹیک سنگھ چھوڑ کر نہیں جاتا۔

''ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان تھا درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا'' زمین سے انسان کی محبت بہت گہری ہوتی ہے۔ بشن سنگھ کے ذہن سے خون کے رشتے تک مٹ چکے لیکن اپنی زمین سے ہجرت/دوری اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ جس طرح بشن سنگھ کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا مشکل تھا۔ یہی حالت تقسیم کے وقت ہزاروں لوگوں کی تھی۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت نے منٹو کو بھی بہت متاثر کیا۔ انھوں نے بعد میں تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت اور اس کے اثرات جیسے المیے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس طرح اخلاقی قدروں کے پامال ہونے پر انسانی ضمیر بیدار کرنے کی کوشش کی۔

برصغیر کی تقسیم کے معاملے میں منٹو کی رائے سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اس تقسیم کی وجہ سے جنم لینے والے حالات کو منٹو نے ایک کیمرے کی آنکھ سے دیکھا اور ایک سچے ادیب کے قلم سے لکھا۔

مہالکشمی کا پُل

کرشن چندر کا شمار عموماً ان افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے برصغیر کی تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کو موضوع بنایا زیرِ نظر افسانہ مہالکشمی کا پُل اگرچہ تقسیم ہند کے موضوع پر نہیں تاہم مصنف نے اس میں طبقاتی تقسیم کا ذکر بہت شد و مد سے کیا ہے۔ افسانے میں طبقاتی تقسیم سے پیدا ہونے والی محرومیوں اور نامرادیوں کا ذکر مصنف کی گہری قوت مشاہدہ کا بہترین ثبوت ہے۔

اُنہوں نے اپنے مخصوص اور تیکھے انداز سے ارباب اختیار (حکومت) پر بھی نشتر زنی کی ہے جو مفلوک الحال طبقے کے مسائل سے چشم پوشی (نظر انداز) کیے ہوئے ہیں۔

لکشمی کا پُل دراصل وہ خطِ تقسیم ہے جس کے ایک طرف امارت اور دوسری طرف غربت کا بسیرا ہے۔ وزیرِ اعظم کی گاڑی کو اس پُل پر سے گزرنا ہے۔ افسانہ نگار کی خواہش ہے کہ وزیرِ اعظم کی گاڑی چند لمحوں کے لیے پُل پر رُکے۔ اور وزیرِ اعظم لوہے کے جنگلے پر پڑی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو دیکھیں جو چال نمبر 8 میں رہنے والی خواتین کے زیرِ استعمال ہیں۔ یہ بوسیدہ اور بدرنگ ساڑھیاں اپنی مالکنوں کی مفلسی اور بدحالی کا اعلان کر رہی ہیں اور معاشرے کے پس ماندہ طبقے کے چھ نمائندہ گھروں کی داستانِ حیات سنا رہی ہیں۔

ان ساڑھیوں کو پہننے والی خواتین اپنے بھوکے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن رات محنت مزدوری کرتی ہیں۔ غربت اور احساسِ محرومی سے مارے ہوئے شوہروں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اُن کے ظلم سہتی ہیں اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹتی ہیں۔ اپنی ضرورتوں کو بے ضرورت جان کر صبر کرتی ہیں۔ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو تقدیر کا جبر سمجھ کر سہتی ہیں۔ لیکن اپنی عزت کا سائبان تانے زندگی سے مصروفِ پیکار ہیں۔

اس کے برعکس لکشمی پُل کے دوسری طرف شان و شوکت اور چمک دمک رکھنے والوں کا ہجوم ہے۔ جو اگرچہ

معاشی طور پر خوشحال ہیں لیکن ان کے ضمیر احساس سے خالی ہیں۔

مصنف نے اس افسانے میں ایک طرف غریب و محنت کش طبقے کے مسائل، مشکلات طرز زندگی اور اُن کی جذباتی و نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف امیر طبقے کی بے حسی، ظلم اور سماجی ناانصافی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ساتھ ہی حکمرانوں کی غفلت اور بے نیازی کی منظر کشی بھی کی ہے۔ مصنف کے مطابق پہلی بھورے رنگ کی ساڑھی شانتا بائی کی ہے جو تین بچوں کی ماں ہے۔ شانتا کا شوہر محنت مزدوری کرتا ہے۔ خود شانتا لوگوں کے گھروں میں برتن مانجتی اور اپنی دھوتی ہے شانتا کی چھ سال کی بیٹی اس کام میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ دو چھوٹے بچے سارا دن بھوک سے بلکتے رہتے ہیں۔ باجرے کی روٹی اور ٹھنڈا پانی اس گھر کا مقدر ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترستا ہوا یہ گھرانہ اپنے طبقے کا نمائندہ گھرانہ ہے دونوں میاں بیوی محنت کے باوجود اپنے بچوں کی پھیکی زندگی میں خوشیوں کے رنگ نہیں بھر سکتے۔

دوسری پیوند لگی ساڑھی جیونا بائی کی ہے۔ ڈھل ڈھل کر اس کا رنگ بھی پھیکا پڑ چکا ہے۔ جیونا کے شوہر ڈھونڈو کو مل کے مالکوں نے بڑھاپے اور کھانسی کی وجہ سے مل سے نکال دیا تھا۔ اس کا غصہ اُس نے جیونا پر اُتارا اور مار مار کر جیونا کی آنکھ زخمی کر دی بعد میں صحیح علاج نہ ہونے کی وجہ سے آنکھ ضائع ہو گئی۔ جیونا کو آنکھ ضائع ہونے کا دکھ تھا۔ لیکن شوہر پر غصہ نہ تھا۔ شوہر کی تیس سالہ رفاقت کو وہ تھوڑی دیر کے غصے کی خاطر ختم نہیں کر سکتی تھی۔ اس قصے میں ایک طرف غریب طبقے کی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں اور دوسری طرف معاشرے کی بے حسی اور بے رحمی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ 35 سال سے ایک مل میں کام کرنے والے مزدور کو بیماری کی حالت میں خالی ہاتھ مل سے نکال دیا گیا۔

تیسری ساڑھی مصنف کی بیوی ساوتری کی ہے۔ مصنف کلرک ہے اس کے آٹھ بچے ہیں۔ سُود در سُود قرض

کے بوجھ تلے دبے ہوئے یہ میاں بیوی مشکل سے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اپنے بچوں کو سکول میں نہیں پڑھا سکتے۔ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ساوتری اپنی والدہ کی بیماری اور پھر اُس کی وفات پر نہ جا سکی۔ بڑے بڑے سیاستدان اور حکومتی افراد لمبے لمبے بھاشن (تقاریر) دینے کے بعد چین کی نیند سوتے ہیں اور جن لوگوں کے ووٹوں سے اقتدار میں آتے ہیں اُنھی کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔

چوتھی ساڑھی جھبو بھیے کی بیوی لڑیا کی ہے۔ جھبو کو کارخانے کے مالک نے معمولی جھگڑے پر کارخانے سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد اسے کہیں کام نہیں ملا بقول مصنف کے غریب کو گالی کھانے کا حق ہے گالی دینے کا نہیں۔ لڑیا اپنے شوہر کی احسانمند ہے کہ جھبو نے اُسے ایک بدمعاش سے خرید کر اس سے شادی کر کے اسے عزت کی زندگی دی۔ شوہر کی بے روزگاری کے دنوں میں لڑیا سبزی بیچ کر گزارہ کرتی ہے۔ اس کے باوجود گھر میں فاقہ رہتا ہے اور جوان جھبو روزگار کے لیے ترستا ہے۔ جبکہ روزی دینے والے صرف سزا دینا جانتے ہیں

پانچویں ساڑھی سولہ سال کی ایک بیوہ منجولا کی ہے۔ جس کا شوہر شادی کے چھ ماہ بعد کارخانے کی ایک مشین کے خراب پٹے کی لپیٹ میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ کارخانے کے مالک نے اسے مزدور کی لاپرواہی کہہ کر جان چھڑا لی۔ یہ ناانصافی اور طبقاتی ظلم جہاں ایک انسانی جان کی قیمت ایک مشین کے پٹے سے بھی زیادہ سستی ہے حکمرانوں اور امیر طبقے کی بے حسی غفلت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ منجولا بیوہ ہوتے ہوئے بھی سرخ ساڑھی پہننے پر مجبور ہے اس میں سفید ساڑھی خریدنے کی سکت نہیں۔ منجولا کی ساڑھی انسانی جذبات احساسات اور دکھوں کی داستان سنا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی ایک بوڑھی بھنگن کی ہے۔ جو گولی کا نشانہ بن چکی ہے۔ یہ اُن لوگوں کی کہانی ہے کہ جن کے

سروں پر چھت نہیں کھلا آسمان ہے۔ وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ بوڑھی عورت کے مرنے کے بعد اس کی بہو ساڑھی استعمال کرتی ہے۔ کیونکہ زندہ لوگوں کو تن ڈھانپنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ بنیادی انسانی ضرورتوں کے لیے ترستے ہوئے یہ لوگ جب احتجاج کرتے ہیں تو بدلے میں اُنہیں جیل جانا پڑتا ہے یا گولی کھانی پڑتی ہے۔

جینے کے لیے حق مانگنے والے یہ افراد ایک آزاد ملک کے لیے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیسی آزادی ہے جس میں آزادی کا فائدہ صرف اعلیٰ طبقے کو حاصل ہے جبکہ غریب طبقہ اس نام نہاد آزادی کے باوجود طبقاتی غلامی میں جکڑا ہوا مسائل در مسائل پابہ زنجیر ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم مشکلات و مسائل کا شکار یہ طبقہ حکمرانوں کی عدم توجہی اور غفلت کا شکار ہے۔

امیر اور غریب طبقے کے درمیان بنی ہوئی اس خلیج کو کون پاٹے گا جبکہ حکمرانوں کے پاس چند لمحے کی فرصت نہیں کہ دکھوں میں گھرے ہوئے ان لوگوں کے مصائب دیکھ سکیں۔

مصنف کے مطابق یہ خلیج اب بدرو کی شکل اختیار کر چکی ہے اگر اس کی صفائی نہ کی گئی یوں اس کو ختم نہ کیا گیا تو کوئی آر پار نہ جا سکے گا۔ پھر عبادت گاہیں بھی روحانی صفائی نہ کر سکیں گی۔

گویا مصنف اس طبقاتی خلیج کو ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ پُل کے دونوں طرف کے لوگ عزت کے حقدار ہوں۔

(11)

Samina

پُوس کی رات

پریم چند نے افسانہ پُوس کی رات میں دیہاتی زندگی کی تلخیوں خاص طور پر کسانوں کی زندگی کے تکلیف دہ، معاشی، سماجی اور نفسیاتی مسائل کو بھرپور طریقے سے بیان کیا ہے۔ اور زمینداروں اور وڈیروں کی بالادستی اور ظلم کا نقشہ کھینچا ہے۔

یہ افسانہ پریم چند کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ مصنف نے کہانی کا مواد اپنے اردگرد پھیلی ہوئی جیتی جاگتی زندگی سے حاصل کیا ہے اس طرح ادب اور زندگی کے رابطے کو زبردست فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُردو ادب کے لیے غربت و افلاس کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں تاہم دیہاتی زندگی کی جتنی سچی اور کھری تصویر پریم چند نے پیش کی ہے اتنی اچھی مصوّری کوئی اور افسانہ نگار شاید ہی کر سکا ہو۔ افسانے کا مرکزی کردار ہلکو ایک غریب بے بس اور مظلوم کسان ہے۔ دن رات کھیتوں میں محنت کرنے والا یہ شخص ہمیں آسمانی اور زمینی آفات اور مصائب کی زد میں نظر آتا ہے۔ قدرت مہربان ہے کہ اس کی محنت سے تیار کی ہوئی کھیتی کا صِلہ ملنے کو ہے لیکن شہنا جو کہ گاؤں کا زمیندار ہے اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کرتا ہے۔ زمیندار کی گالیوں کے ڈر سے ہلکو اپنی بیوی مُنی کی منت سماجت کر کے اس سے وہ تین روپے مانگتا ہے جو اس کی بیوی نے کمبل خریدنے کے لیے جمع کر رکھے ہیں۔ زمیندار کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے دونوں میاں بیوی یہ رقم زمیندار کو دے کر وقتی طور پر اپنی جان چھڑوا لیتے ہیں۔ لیکن رات کو ہلکو کو شدید سردی میں اپنی فصل کی حفاظت کی غرض سے کھیت میں جانا پڑتا ہے۔ اس کا وفادار کتا جبرا بھی اس کے پیچھے پیچھے آجاتا ہے۔ کھیت میں رات کے وقت اس قدر سردی ہوتی ہے کہ ہلکو اور جبرا دونوں ٹھٹھر جاتے ہیں مالک اپنے وفادار کُتے کو پیار سے پچکارتا ہے۔ اپنی گود میں بٹھا کر اسے گرم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے ساتھ اس سردی میں

آنے پر اسے لاڈ سے اٹھاتا ہے۔ کتا بھی اپنے مالک کے مزاج سے پوری طرح واقف ہے۔ ہلکو جبرا اور خود کو کڑاکے کی سردی میں اکڑنے سے بچانے کے لیے بہت جتن کرتا ہے۔ ارہر کے پتے اور پودے سمیٹ کر آگ کا الاؤ جلاتا ہے۔ آگ کی روشنی اور تپش دونوں کو قدرے سکون دیتی ہے۔ اس تپش کی وجہ سے رات کے آخری پہر ہلکو کچھ سست پڑ جاتا ہے۔ تاہم ایثار و وفا کے جذبے سے سرشار جبرا کھیت میں آہٹ محسوس کر کے مالک کی گود سے نکل بھاگتا ہے۔ نیل گائیں اس ہرے بھرے کھیت پر حملہ کر دیتی ہیں۔ جبرا اپنے مالک کی محبت اور وفاداری کے جذبے سے سرشار ادھر سے اُدھر بڑے جوش سے بھونکتا ہوا بھاگتا ہے۔ لیکن نیل گائے کھیت کو اُجاڑنے لگتی ہیں۔ کتے کی آواز سے ہلکو کو سمجھ آ جاتی ہے کہ جانوروں نے کھیت پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شدید سردی اور رات بھر جاگتے رہنے سے ہلکو کو اپنی ہڈیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور پھر اُس نیند کا کیا جائے جو سُولی پر بھی آ ہی جاتی ہے۔ ادھر ہلکو پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا ہے۔ اُدھر جبرا نیل گایوں کو ہٹانے کے چکر میں اُن کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنی جان کا نذرانہ دے دیتا ہے۔ لیکن اس عظیم جانور کی قربانی کے باوجود کھیت اُجڑ جاتا ہے۔ صبح کے وقت ہلکو کی بیوی منّی آ کر ہلکو کو جگاتی ہے اور اس کے نصیب کے سو جانے کی خبر سناتی ہے۔ اور پھر اُسے مشورہ دیتی ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ کر مزدوری کر لو تا کہ مستقل روزی کا ذریعہ بن سکے۔ اس طرح تھوڑا تھوڑا قرض بھی ادا ہو جائے گا اور زمیندار کی غلامی سے بھی نجات مل جائے گی۔

لیکن نصیب کے سوتے ہی ہلکو کی خود ساختہ غیرت جاگ اُٹھتی ہے ''کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا چاہے کتنی دُرگت ہو جائے'' ایسا معاشرہ جہاں ایک طرف زمینداروں اور وڈیروں کی شکل میں ظلم اور بے حسی کا ڈیرہ ہے تو دوسری طرف غربت، جہالت اور پس ماندگی کا راج ہے۔ ہلکو جیسے کرداروں پر ظلم ہونا کوئی

انہونی بات نہیں ہلکو جیسے لوگ اگر کاشتکاری (اپنا آبائی پیشہ) چھوڑ کر مزدوری کر بھی لیں تو اُن کی محنت کی کمائی قرض میں چلی جائے گی۔ حالانکہ یہ وہ قرض ہے جو ہلکو نے نہیں لیا۔ بلکہ اُس کے آباؤ اجداد نے کبھی لیا تھا جو سُود در سُود بڑھتے ہوئے نسل در نسل منتقل ہو کر ہلکو تک پہنچ چکا ہے۔ یہ قرض کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

بقول منی کے ''جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا'' مصنف نے اس افسانے میں ایک غریب اور مظلوم کسان کی بے بسی کی داستان بیان کرتے ہوئے انسانی نفسیات کو بھی خوب اُجاگر کیا ہے اور قاری کو ناانصافی اور ظلم پر مبنی اس معاشرے کی اصلاح خصوصاً زمینداری نظام کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے دعوتِ فکر دی ہے تاکہ معاشرے میں پائے جانے والے طبقاتی فرق ناانصافی بے حسی اور ظلم و ستم کا خاتمہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس جاہلانہ سوچ کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ لوگ صدیوں سے جس کام سے وابستہ ہیں بار بار اس میں نقصان اُٹھانے کے باوجود اس سے جُڑے رہنا چاہتے ہیں۔ یہی سوچ اُنہیں طبقاتی غلامی سے چھٹکارا نہیں دلانے دیتی۔